ساحل کے مباحث پر نقد

محمد ظفر اقبال

مدیر ساحل السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔خدا کرے مزاجِ گرامی بعافیت ہو۔

[۱]راقم آپ کے حالات سے بےخبر، بلکہ صورت تک سے آشنا نہیں ہے، معتبر ذرائع سے عموماً اور ماہ نامہ ''ساحل'' کے مطالعہ سے خصوصاً آپ کے دینی ذوق، افکار وخیالات، لگن اور انہماک اور امتِ مسلمہ کے اصلاحِ احوال پر آپ کے جذبات واحساسات کا علم ہوتا رہتا ہے، میں آپ کی تمام تر کاوشوں اور صلاحیتوں کا، باوجود اختلاف کے، مداح، قدر دان اور معترف ہوں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو معلومات کی وسعت اور تحریر کی عمدہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

[۲]''ساحل'' کے گزشتہ کئی، بلکہ اکثر شماروں میں بعض شخصیات، خصوصاً مولانا تقی عثمانی صاحب اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے حوالہ سے آپ کا طرزِ گفتار اسلوبِ تحریر اور تبصرہ، تجزیہ، باوجود علمی ہونے کے معاندانہ ومخاصمانہ معلوم ہوتا ہے، ان موضوعات پر آپ کے موقف اور دلائل کا درست ہونا یا نہ ہونا بعد کی بات ہے، جس پر فرصت کے لمحات میں کچھ عرض کرسکوں گا۔

[۳]اب جو بحث آپ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی کتاب Reconstruction of Religions thought in Islam کے حوالہ سے چھیڑ بیٹھے ہیں، میں آپ کے طرزِ استدلال سے عدم مناسبت کے باوجود ''اجتہاد'' کے حوالہ سے آپ کی فکر کا پرزور حامی ہوں۔لیکن سہیل عمر صاحب کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ اس دفینے کو اُکھاڑ کر آپ نے کوئی مثبت اور ایجابی کام نہیں کیا۔Reconstruction کے اکثر مباحث، اس کی زبان اور قریب قریب سارا فلسفہ وطریقِ استدلال، سائنس، جدید فلسفہ اور نفسیات کی موجودہ صورتِ حال میں اجنبی ہو چکا ہے، اہل علم کی اکثریت اسے قبول کرنے سے مانع رہی ہے۔اور تو اور خود اقبالی فکر کے پرجوش حامیان اور ماہرین کی اکثریت، الا ماشاء اللہ، اسے پورے طور پر سمجھنے سے قاصر رہی ہے، گویا یہ کتاب طاقِ نسیاں کی زینت بن چکی تھی، آپ کی اس بحث کے بعد، اس جو اس کتاب کا جارحانہ انداز میں، مشنری جذبہ کے تحت، صرف فکر اقبال کو درست باور کرانے کے لیے، غلط سلط تحلیل وتجزیہ کیا جائے گا، اس سے جس گمراہی کے پھیلنے کا اندیشہ ہے، اس میں بڑی حد تک آپ کا حصہ ہوگا۔

کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے

[۴]حضرت اقبال کے غالی معتقدین اور پرجوش حامیان، اگرچہ زبان سے نہیں کہتے لیکن عملاً اقبال کو فکر وزبان کی غلطی سے مبرا سمجھتے ہیں، اقبال کے کسی کمزور سے کمزور بیان سے اختلاف کو اقبال دشمنی اور مخالف کی کم فہمی وعدم علمی پر محمول کرتے ہیں، خواہ یہ اختلاف کیسے ہی صاحبِ علم ونظر نے کتنے ہی محکم دلائل کی روشنی میں کیا ہو۔اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ اقبال علوم اسلامیہ پر اس درجہ عبور نہیں رکھتے تھے، جس درجہ مہارت ''اجتہاد'' جیسے نازک اور اہم منصب کے لیے درکار ہے تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟ اس کے جواب میں جارحانہ اور غیر تحقیقی طرزِ عمل کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ مثلاً سہیل عمر صاحب کا یہ بیان کہ ''اگر علامہ سید سلمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اقبال کے خلاف کچھ لکھتے تو ان کا رسالہ اور کتاب امت سے چھن جاتا''۔کس قدر جذباتی، عامیانہ اور ''حبک الشیٔ یعمی ویصم'' کا مظہر ہے، مان لیجیے، اقبال کے خلاف لکھنے سے ان کی کتاب اور رسالہ امت سے چھن جاتا تو کیا اس سے غلط مؤقف درست ثابت

ہوجاتا؟ مولانا ندویؒ اور مولانا دریابادیؒ وہ شخصیات ہیں، جن سے اقبال اسلامیات کے مخلص طالب علم کی حیثیت سے برابر استفادہ کرتے آئے ہیں، اور مولانا سلیمان ندویؒ کو تو ''علومِ اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' اور علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد ''استاذ الکل'' قرار دے چکے ہیں۔ سو اگر وہ کسی مسئلہ میں اقبال سے اختلاف کرتے ہوئے کچھ لکھتے تو ''ان نادان دوستوں'' کے برعکس، اقبال نہایت سنجیدگی سے اس اختلاف پر غور کرتے اور اپنی غلطی واضح ہوجانے کے بعد، اپنے سابقہ مؤقف سے رجوع کرنے میں انھیں کوئی شرمندگی نہیں ہوتی اہلِ حق اور باصفا لوگوں کا یہی شیوہ ہے۔

الزامی طور پر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر اقبال کو، ابن عربیؒ، جن کا کوئی جوڑ نہیں، پر اعتراضات کا حق حاصل ہے تو دیگر اہلِ علم کو بھی اقبال سے تمام تر احترام وعقیدت کے باوجود، سنجیدہ و استدلالی انداز میں اختلاف و اعتراض کا پورا حق حاصل ہے، کیا ہمارے دوست اقبال کی وہ تحکمانہ رائے جسے ''فتوے'' سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا، بھول گئے جو انھوں نے ابنِ عربیؒ کے متعلق صادر فرمائی ہے: ''شیخ کی تعلیمات، تعلیمِ قرآن کے مطابق نہیں، اور نہ کسی تاویل وتشریح سے ہوسکتی ہیں''۔ نیز: ''جہاں تک مجھے علم ہے، ''فصوص'' میں سوائے الحاد وزندقہ کے کچھ نہیں''۔

ابن عربیؒ کے مکتب فکر کے سب سے بڑے ناقد حافظ ابنِ تیمیہؒ، تمام تر اعتراضات کے باوجود ان کے مقامِ بلند کا پاس و لحاظ رکھتے ہیں، جناب احمد جاوید صاحب لکھتے ہیں: ''کم از کم ہمیں تو یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اپنی متنازعہ فی شخصیت کے باوجود ابنِ عربیؒ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ابن تیمیہؒ تک کا سانس اکھڑ جاتا ہے، انھیں کسی بھی سطح پر علامہ اقبالؒ کے ساتھ bracket کرنا، ذہنی عدم توازن کی دلیل ہوگا''۔ [اقبالیات: ۲:۳۷]

اب اگر اقبال، ابن عربیؒ پر، ان کی کتابوں کے براہ راست مطالعہ کے بغیر [ساحل، ۱۴۲۷ھ، ص۶۹] اتنی سخت رائے دے سکتے ہیں اور کا نام ''تحقیق'' اور ''تلاشِ حق'' رکھا جاسکتا ہے، تو دیگر اہلِ علم کو Reconstraction کے مباحث سے علمی وتحقیقی بنیاد پر اختلاف کا حق کیوں حاصل نہیں ہے؟ اس پر تیوری کیوں بگڑ جاتی ہے؟ آستینیں کیوں چڑھ جاتی ہیں؟ ہاں! اگر معترض کے اعتراضات میں کوئی غلطی ہو یا اس تک فکرِ اقبال کی تسہیل وتفہیم صحیح معنوں میں نہ ہوسکی ہو تو اس کی تغلیط بھی ضروری ہے، مگر سنجیدہ اور علمی انداز سے، نہ کہ سہیل عمر صاحب کے مذکورہ تحکمانہ جواب کی صورت میں۔

[۵] آج ماہرین اقبال یہ کہہ رہے ہیں کہ اقبال نے اجتہاد کی ضرورت کا دعویٰ کیا ہے لیکن خود مجتہد بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ ہم اس بیان سے اتفاق کے باوجود اپنے ان کرم فرماؤں کو دعوت دیتے ہیں کہ اقبال کے ''اجتہادات'' ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کی کتاب ''اقبال کا تصورِ اجتہاد'' کے چھٹے باب میں بہ عنوان ''اجتہاداتِ اقبال'' ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ اگر اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا جائے کہ یہ اقبال کا ''اجتہاد'' نہیں بلکہ ان کی ''رائے'' ہے تو پھر ہم ادب سے عرض کریں گے کہ آپ حضرات کے خامۂ گوہر بار کو اس وقت جنبش کیوں نہ ہوئی جب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب [جو اقبال کو ''مجتہد مطلق'' باور کراتے ہیں] اقبال کی مختلف آراء کو ''اجتہاداتِ اقبال'' کے نام سے شائع فرمارہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس وقت ''وضاحتی مضمون'' شائع کردیا جاتا۔ اگر کسی کے مقام کو اس کی اصل حیثیت سے گرانا غلط بات ہے تو مداح سرائی میں غلو وافراط بھی قابلِ تردید ومذمت ہے۔

[۶] آج کل نہایت شدت کے ساتھ یہ باور کروایا جارہا ہے کہ امتِ مسلمہ کی اس زبوں حالی کے ذمہ دار علماء ہیں، انھوں نے اجتہاد کے دروازے کو بند کرکے امت کی علمی وفکری صلاحیتوں پر جمود وتعطل کا قفل لگادیا، اور اقبال وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے اجتہاد کا نکتہ اٹھا کر امت کی درست سمت کی جانب رہنمائی کرنی چاہی، لیکن مولوی ان کے خلاف ہوگئے۔ حق چونکہ اپنے آپ کو منوا ہی لیتا ہے، اب ایک عرصہ بعد علماء کسی نہ کسی ڈھب سے اجتہاد کی بات کرنے لگے ہیں۔

یہ بات ابتداً واضح ہوجانی چاہیے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں مطلق اور مقید۔ اجتہاد کی نوعِ اول [یعنی بنیادی اصول وضوابط

اور کلیات کی تعیین] ختم ہو چکی، اس کا دروازہ کسی مولوی یا امام نے بند نہیں کیا، بلکہ حضراتِ ائمہ مجتہدین نے اسے اس درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے کہ آئندہ ان سے منتفع ہونے کی صورت تو رہ جاتی ہے، لیکن کسی نئی تحقیق وجستجو کی ضرورت نہیں، قانونِ الٰہی ہے کہ جس وقت جس میدان میں کام کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس میدان میں اپنے بندوں کو وافر صلاحیتیں عطا فرما دیتے ہیں۔ جب روایت حدیث کے میدان میں کام ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضراتِ محدثین کو ایسے قوی حافظوں سے نوازا کہ ایک ایک محدث کو بلا مبالغہ لاکھوں احادیث مع سند ورجال ازبر ہوتی تھیں، جب حدیث کا عظیم الشان ذخیرہ مرتب ومدون ہو کر سفینوں میں منتقل ہو گیا تو اب قوتِ حافظہ بہ تدریج گھٹنی شروع ہو گئی اور آج ہمارے قوتِ حافظہ کا یہ عالم ہے کہ کسی محدث کے بے مثال حافظہ کے بارے میں پڑھ یا سن کر اسے افسانہ ورنہ خرقِ عادت تو سمجھتے ہی ہیں۔ اسی طرح جب اسلام کا روایتی حصہ اپنے تکمیلی مراحل سے گزر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضراتِ فقہاء کرام کو اصول وضوابطِ فقہ مقرر کرنے، استنباط واستخراجِ مسائل، سرعتِ انتقال اور فہم وروایت کی ایسی اعلیٰ اور نادر صلاحیتوں سے نوازا کہ آج ان کے روایت وفہم پر گفتگو کرتے ہوئے خامہ انگشت بہ دنداں ہے۔ اسلام کی ابتدائی تین چار صدیوں میں بہت سے مجتہد مطلق پیدا ہوئے، جن کے اپنے اصول تھے اور ان ہی اصول وضوابط کی روشنی میں وہ اخذ واستباطِ مسائل کرتے تھے، لیکن جوں ہی اصول وضوابطِ فقہ اور علل واستخراجِ مسائل کی ترتیب وتبویب مکمل ہوئی، تو تدریجی طور پر امت سے وہ فہم بھی رخصت ہوا۔ آج جدید استنباط واستخراج کی بات تو رہی ایک طرف، اصولِ فقہ کا کسی فقہی مسئلہ پر اطلاق وانطباق، جزئیات وکلیات کے درمیان ربط وتسلسل اور صورتِ انسلاک کو بھی پوری طرح سمجھنے کا فہم نہیں رہا، گو اپنی مضمحل صورت ہی میں سہی آج بھی امت میں جنسِ حافظہ وفہم موجود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امکانِ عقلی کی حد تک مجتہد مطلق کا وجود ہر دور میں مسلم ہے، لیکن چوتھی صدی کے بعد کوئی ایسا مجتہد مطلق نظر نہیں آتا، جسے قبولِ عام نصیب ہوا ہو، ابن جریر الطبریؒ، حزمؒ اور امام جلال الدین السیوطیؒ نے اپنے اپنے دور میں ''مجتہد مطلق'' ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن اسے امت میں قبول عام نصیب نہیں ہوا۔ آج بھی اگر کوئی صاحب علم ''مجتہد مطلق'' بن کر دکھلا دیں اور ان کی سعی درست ثابت ہو جائے تو امت اسے ماننے کے لیے تیار ہے، بہ شرط یہ کہ وہ مجتہد مطلق ہی رہے، مرزا قادیانیہ نہ بن جائے، جو پہلی منزل پر اجتہادِ مطلق کا مدعی تھا اور آخری منزل پر خدائی کا۔

بہر حال اجتہاد کی ایک نوع، یعنی اجتہادِ مطلق، اپنے کمال کو پہنچ کر ختم ہو گئی، اب بجز اس سے نفع اٹھانے کے اور کوئی صورت نہیں، اس لیے اس بحث میں پڑنا کہ مجتہد مطلق پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں، اس پر بحث کرنا ایک بدیہی مسئلہ کو نظری بنا دینے کے مرادف ہے، مشاہدہ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو واقعی ''مجتہد مطلق'' ہونے کے مدعی ہیں، جن کے نزدیک ''اجتہاد'' کے لیے علوم دینیہ پر مہارت تو دور کی بات ہے، مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے، مگر ان ''مجتہدانِ عصر'' نے آج تک تغیر پذیر دنیا کا کون سا مسئلہ حل کر دیا ہے؟ اور جب ان سے حل نہ ہو سکا تو اب نیا مجتہدِ مطلق پیدا ہو کر کیا کر لے گا؟

جہاں تک مسلمہ فقہی مکاتبِ فکر کے اصول وضوابط کے دائروں میں ''اجتہاد'' کا تعلق ہے اس کا دروازہ کسی نے بند نہیں کیا۔ بلکہ وہ قیامت تک کھلا ہوا ہے۔ جس میں وقت کی رفتار اور حالات کے تغیر کے پیش نظر، فقہ کے قدیم وعظیم ذخیروں کی حفاظت اور ان میں تدبر وتفکر اور غور وخوض کرتے ہوئے ''اجتہاد'' کیا جاتا ہے۔ علماء نے نہ اس سے کبھی منع کیا ہے اور نہ پیچھے ہٹے ہیں۔ اقبال نے ''اجتہاد فی الاسلام'' کا مقالہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو اسلامیہ کالج حبیبہ ہال میں سنایا اور ایک مقالہ ''اسلام کے تشکیلی ڈھانچے میں اصولِ حرکت'' مدارس، حیدر آباد اور علی گڑھ یونیورسٹیوں میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء کے دوران پیش کیا..... اس سے بہت عرصہ قبل ۲۳ر محرم الحرام ۱۳۳۱ھ میں، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جامع مسجد غازی پور میں تقریر کے دوران اجتہاد کی اس نوع کو اور اس کی ضرورت کو بیان فرما چکے ہیں، فرماتے ہیں:

''ایک تفریع، کہ قیامت تک ان ہی اصول پر حوادثِ جزئیہ کے احکام کی تفریع کرتے رہنا، یہ کام علم وفہم کا ہے، اگر چہ حق

تعالیٰ نے اجتہادِ مطلق کو ختم کر دیا ہے، نہ اس وجہ سے کہ، معاذ اللہ، خداوند کریم کی رحمت ختم ہوگئی ہے، اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا قاعدہ اور اس کی عادتِ مستمرہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی، اس وقت اس کو ختم کر دیتے ہیں، اس عادت کے موافق چونکہ حضراتِ مجتہدین کے بعد اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی، اس لیے اس کو ختم کر دیا، البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی، اس لیے اتنا ''اجتہاد'' اور اتنا فہم قیامت تک کے لیے باقی ہے، جس کے مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں، چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نئے نئے جزئیات میں حکمِ شرعی بتلاتے رہتے ہیں اور مجتہدین کے اصول ہی پر جزئیات حادثہ کو متفرع کرتے رہتے ہیں''۔
[خطباتِ حکیم الامۃ ......ج ۳، ۵۳۔۵۴]

یہ بات حضرت تھانویؒ نے صرف بیان و وعظ کی حد تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ بہت سے مسائل میں اس نوع کے اجتہاد کی عملاً کوشش کی، مثلاً مفقود کی بیوی، متعنت کی بیوی اور عنین کی بیوی کے لیے جو احکامات ہمارے ہاں تھے وہ زمانۂ حال کے موافق نہ تھے اور فقہ مالکی میں اس سلسلہ میں مفصل اور مناسبِ حال احکامات تھے اس لیے مولانا تھانویؒ نے ''الحیلۃ الناجزۃ لکھ کر، علماء زمانہ سے استصواب فرمایا اور ان کو اپنا لیا اور آج ہمارا پورا معاشرہ اسی پر عمل پیرا ہے۔اس نوع کے اجتہادات کے مزید نمونے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی کتب اور فتاویٰ میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔اس موضوع پر تفحص سے مزید نظیریں اور حوالہ جات پیش کیے جاسکتے ہیں کہ اپنے اپنے فقہی دائروں میں اجتہاد کا عمل ہر دور میں جاری رہا۔اگر ہم کم از کم: [۱] خلافتِ عثمانیہ کے عہد میں ''مجلۃ الاحکام العدلیۃ'' کی تدوین [۲] جنوبی ایشیا کی مغل حکومت کے دور میں ''فتاویٰ عالم گیری'' کی تدوین ہی پر توجہ کریں، تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اس میں سابقہ فقہی ذخیرے پر غور و تفکر، نظرِ ثانی اور نئے پیش آمد مسائل کے لیے اجتہاد کا عمل ہوتا رہا ہے۔آج سعودی عرب میں فقہ حنبلی عملاً نافذ ہے، اگر آج کے سعودی فقیہا و قضاۃ کے فیصلوں پر نظر ڈالیں تو وہ آپ کو آج سے ڈیڑھ دو سو برس قبل کی جزئیات کی شکل میں نہیں بلکہ جدید دور کی ضروریات کے مطابق جدید اجتہادات کی روشنی میں اپنے ارتقائی منازل طے کرتی نظر آئے گی۔اگر آپ جمہوریہ مصر کی وزارتِ انصای کی طرف سے ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء میں بیس جلدوں میں شائع ہونے والا ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' المعروف ''الموسوعۃ جمال عبدالناصر الفقہیۃ'' اور حکومتِ کویت کی طرف سے تیس جلدوں میں شائع کردہ ''الموسعۃ الفقہیۃ'' پر نظر ڈالیں، تو یہ سب کاوشیں آپ کو تمدنِ جدید کے تقاضوں اور جدید اجتہادات و اصطلاحات کی صورت میں نظر آئیں گی۔

اسی طرح برصغیر میں مغل حکومت کے زوال کے بعد جب اجتہادی کاوشیں اور افتائی محنتیں انفرادی دائروں میں آگئیں اور مختلف مدارس میں ''دارالافتاء'' قائم ہوئے تو بلا مبالغہ گزشتہ دو سو برسوں میں ان مراکزِ افتاء نے لاکھوں فتاویٰ جاری کیے اور تغیر پذیر دنیا کے بیشتر مسائل کا ''صحیح'' یا ''ناقص'' حل پیش کیا اور علمی و عوامی حلقوں میں اعتماد و استناد کا درجہ حاصل کیا، دینی معاملات میں آج بھی حالات کی یک سر تبدیلی، عالم گیر بگاڑ اور علماء کے خلاف پروپیگنڈے کے باوجود ان مولویوں ہی کی بات کو ''حرفِ آخر'' سمجھا جاتا ہے، اس کی نہایت آسان اور قابلِ مشاہدہ مثال یہ ہے کہ آج جو لوگ اجتہاد کے مدعی ہیں، انھیں سب سے بڑی شکایت ہے کہ علماء اجتہاد کی اجازت نہیں دیتے، بھئی اگر عوام میں علماء اپنی وقعت کھو چکے ہیں اور آپ کے نزدیک جدید تعلیم اور حقیقی اسلامی ذوق علم سے نا آشنا ہیں تو آپ کو اپنے مزعومہ اجتہاد کے لیے ''ملا'' سے سندِ جواز و تائید حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے، آپ اجتہاد کیجیے۔

الغرض راقم کے نزدیک مسلمہ فقہی اصول و ضوابط کے تحت امتِ مسلمہ میں اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا، علماء اپنی اپنی صلاحیتوں کے موافق اجتہاد کے عمل میں شریک ہوتے ہیں اور جدید مسائل کا ''صحیح'' یا ''ناقص'' حل پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، آپ ان کے فتاویٰ سے اختلاف کا پورا حق رکھتے ہیں، خود ہمیں بھی اختلاف ہے، لیکن یہ کہنا کہ علماء جدید تمدن و مسائل کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور ان میں اجتہاد کی روح مردہ ہو چکی ہے، یہ بات قرین دیانت و انصاف نہیں ہے۔

ہاں! ہمیں اس بات کا بھی ضرور احساس بلکہ اعتراف ہے کہ علومِ اسلامی کے مراکز اور داعیان و نمائندگانِ دین، اس

وقت انتہائی علمی وفکری اضمحلال وجمود کا شکار ہیں، اس ضعف وشکستگی کی وجہ سے یہ حضرات آج اپنی بھرپور نمائندگی اور سربراہی کا فریضہ بہ احسن وجوہ انجام نہیں دے پا رہے، جسے اس عہد میں ان کا خاصہ بننا تھا، ہمارے اسلاف کی گزشتہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے مخالف کو اس کے مسلمہ معیار پر خاموش کرایا ہے۔ اسی وجہ سے آج مخالفینِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اسلام بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میری ناقص رائے میں حضرتِ اقبالؒ بھی اسی جمود وتعطل کو توڑنے کے دل سے خواہاں تھے، اسی لیے انھوں نے اجتہاد کو اسلام کے ''اصولِ حرکت'' سے تعبیر فرمایا تھا کہ اسلامی قانون وفقہ نہایت وسیع اور وسعت پذیر قانون ہے، جس میں خارجی تغیر کے ردوقبول کی پوری اہلیت وصلاحیت موجود ہے، اور وہ انسانی زندگی میں درآنے والے تغیرات اور ہونے والی ترقیات کو اپنے اندر سمو کر کائنات کی رہنمائی کا مکمل فریضہ انجام دے سکتا ہے اور اس پر کسی دور میں جمود وتعطل طاری نہیں ہوسکتا، اقبال نے لکھا ہے:

''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانہ حال کے Jurispudence (اصولِ قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا، اور نبی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا، قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں، غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے، اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا''۔
[اقبال نامہ، حصہ اول، ۵۰۔۵۱]

اس اقتباس سے جہاں اقبال کی دینی تڑپ اور امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر گھلنے پگھلنے کا احساس ہوتا ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو خود اس بات کا اعتراف واحساس تھا کہ ان میں اجتہادی صلاحیت نہیں ہے اور ظاہر ہے اس سے ہمارے ان دوستوں کا مؤقف درست ثابت ہوگیا جن کا کہنا ہے کہ اقبال نے کبھی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کیا۔ خیر! یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ اس مقام پر ہم اس بات کو واضح لفظوں میں بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ فقہ وقانونِ اسلامی کی تدوین جدید [اس خاص عنوان سے اختلاف کے باوجود] سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ فقہ اسلامی کے نئے اصول وضوابط وضع کیے جائیں اور سابقہ فقہی ذخیرہ پر پانی پھیر دیا جائے اور قانونِ اسلامی کی تدوین نو اور اصولِ قانون کی نئی ترتیب وضع کی جائے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ فقہ اسلامی کا وہ عظیم سرمایہ جو انسانی ذہانت و فطانت کا محیر العقول نمونہ ہے، کی روشنی میں جدید نوازل وواقعات کا حل تلاش کیا جائے، اس عظیم سرمایہ کی موجودگی میں امت کو نئے مستقل اجتہاد کی ضرورت نہیں، اگر ہمارے اسلاف اپنے اپنے زمانے میں ''واقعات''، ''اجناس''، ''نوازل'' کے عنوان سے روزمرہ پیش آنے والے مسائل کو یک جا جمع کر کے قدیم فقہی ذخیروں کی روشنی میں ان کا حل تلاش کر سکتے ہیں تو آج بھی فقہاء کرام اسی نہج پر چل کر عرف وعادات اور احوال وظروف کے تغیر کے باوجود جدید مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر ہم پھر اس بات کا اعادہ کریں گے کہ قانونِ اسلامی کی تدوینِ جدید سے ہرگز نئے قوانین کا وضع کرنا مراد نہیں بلکہ سابقہ کلیات سے نئے جزئیات کا استنباط واطلاق مقصود ہے، جس سے اسلام کے اس نظام کو دوبارہ روبہ عمل لایا جاسکتا ہے، جس کے تحت مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام حالات واقعات اور احوال وتمدن کی مکمل تبدیلی کا سامنا کرنے اور اس تبدیلی کے ردوقبول کا فیصلہ کر کے موجودہ ضروریات اور تقاضوں کے مطابق انسانیت کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ بہ احسنِ وجوہ انجام دے سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ [تعبیر وتحریر کی لغزش کے باوجود] اقبال اس سے زیادہ کسی اور چیز کے خواہاں نہیں تھے۔ راقم کا طویل بیان کسی ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں ہے، میں اپنے اس موقف پر اکابر علماء کی تائیدات اپنے ساتھ پاتا ہوں، صرف ایک حوالہ اور اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ لکھتے ہیں:

''حاصل یہ کہ زندگی رواں دواں اور اپنے جلو میں نت نئے مسائل کو لاتی ہے، اس لیے ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ہم کتاب وسنت، اجماع امت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کا حل اس طرح تلاش کریں کہ نہ تو کج روی اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکیں، نہ بزدلی سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں، تشریعِ اسلامی کی تاریخ، فقہی دور کی تکمیل اور ہر زمانے میں جدید مسائل پر کتابوں کی

تصنیف اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جن مسائل پر کتاب وسنت کے نصوص نہیں، ان میں اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، چنانچہ امت اسی اصول پر کار بند رہی ہے، اس لیے جوازِ اجتہاد پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے عقل پیدا کی ہے، انسان میں امانتِ الٰہی کی برداشت کا مدار اسی پر رکھا ہے اور بصائر وعبر میں غور وتدبر کی بار بار دعوت دی ہے''۔[بصائر وعبر، ج ا، ۵۶۸]

جو لوگ ہمارے قدیم فقہی سرمایہ کو بے کار سمجھتے ہیں، میں ان کے لیے مشہور شامی فاضل و ماہرِ قانون مصطفیٰ احمد الزرقاء کی کتاب ''المدخل الفقہی العام الی الحقوق المدنیۃ'' کے مقدمہ سے ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں، جس میں انھوں نے پیرس یونیورسٹی کے ہفتہ قانونِ اسلامی کے سیمینار میں مغربی ماہرینِ قانون کا فقہ اسلامی سے متعلق تاثر اور نظریہ پیش کیا ہے، اس اقتباس سے فقہی ذخیرہ کی وسعت اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں:

''مماثل قوانین کی عالمی اکیڈمی کی مشرقی قانون کی شاخ نے پیرس یونیورسٹی کے لا کالج میں ۲؍جولائی ۱۹۵۱ء میں فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا اور ایک کانفرنس منعقد کی، یہ کانفرنس موسیو Milliot پروفیسر فقہ اسلامی پیرس یونیورسٹی کی صدارت میں ہوئی، اس میں عرب غیر عرب ملکوں کے لاء کالجوں کے اساتذہ، ازہر کے نمائندے، عرب اور فرانسیسی وکلا، نیز مستشرقین بڑی تعداد میں مدعو کیے گئے تھے .....نمائندوں نے، دیوانی، فوجداری، اور مالی قوانین کے پانچ عنوانات پر بحث کی جو اکیڈمی کی طرف سے پہلے متعین کر دیے گئے تھے، وہ حسب ذیل تھے:

[۱] ملکیت کا اثبات [۲] عام مفاد کے لیے استملاک [عوام کی املاک پر قبضہ] [۳] جرم کی ذمہ داری [۴] اجتہادی مذاہبِ فکر کا ایک دوسرے پر اثر [۵] سود کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

یہ سب لیکچر اور مباحث فرنچ میں ہوئے تھے اور ہر موضوع کے لیے ایک دن مقرر تھا، ہر لیکچر کے بعد مقرر اور کانفرنس کے نمائندوں کے درمیان مباحثہ ہوتا تھا جو موضوع اور ضرورت کے حساب سے کبھی طویل ہوتا تھا، کبھی مختصر، اس کا خلاصہ قلم بند کر لیا جاتا تھا۔ اسی قسم کے مباحثہ کے درمیان ایک ممبر جو پیرس کے بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عمومی خیال میں کہ اسلامی فقہ جامد ہے، اور اس میں جدید معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں ہے اور اس کانفرنس کی تقریروں اور مباحثوں سے اصول وشواہد کی بنیاد پر اس کے بالکل برخلاف جو بات ثابت ہو رہی ہے ان دونوں میں کیسے مطابقت پیدا کروں؟

کانفرنس کے اختتام پر تمام نمائندوں نے بالاجماع ایک تجویز پاس کی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اس کانفرنس کے تمام شرکاء ان مباحث کے پیش نظر جو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں پیش ہوئے اور ان بحثوں کی بناء پر جس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ:

[۱] اسلامی فقہ کی ایک خاص [قانونی ودستوری] قیمت ہے جس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

[۲] اس عظیم قانونی سرمایہ میں فقہی مذاہب کا یہ اختلاف، معلومات، مدلولات اور قانونی اصولوں کا بڑا خزانہ ہے، جو اعتراف وتحسین کا پورا مستحق ہے اور اس کے مطابق فقہ اسلامی اس قابل ہے کہ جدید زندگی کی ضروریات اور مطالبات کی تکمیل کر سکے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہفتہ ہر سال منایا جائے اور کانفرنس کے سکریٹریٹ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ ان موضوعات کی ایک فہرست تیار رکھے، جن کو آئندہ جلسہ میں بحث ومذاکرہ کی بنیاد بنانے کی ضرورت ہے اور جن کی اہمیت کا گزشتہ مباحث سے اظہار ہوتا ہے۔

کانفرنس کے نمائندے، اس کی بھی امید رکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی ایک ڈائریکٹری تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جائے گی، جس کے ذریعہ قانون کی کتابوں سے استفادہ اور مراجعت آسان ہو جائے گی اور وہ ایک فقہی انسائیکلو پیڈیا بن سکے گی، جس

میں اسلامی قانون کی تمام معلومات جدید طرز پر مرتب کی گئی ہوں''۔[اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش،۲۷۳۔۲۷۴]

اس اقتباس کے نقل کرنے سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہم مستشرقین سے مرعوب ہیں کہ جس بات کو مستشرقین سے ''سندِ تائید'' عطا ہوجائے وہ ثریٰ سے ثریا تک پہنچ جاتی ہے، بلکہ اپنے فقہی سرمایہ کی قدر و قیمت اور مستشرقین کے انہماک و تو غل کی طرف توجہ مقصود ہے۔ یہ کام اسلامی مملکت کا ہونا چاہیے تھا کہ وقت کے جامع ترین اور دین اور دینیات کے ہر ہر شعبہ میں مجتہدانہ بصیرت کے حامل، معتمد علماء وفقہاء اور علومِ عصریہ اور ماہرینِ قانون کے دین دار طبقہ کا ایک مشترکہ بورڈ تشکیل دیتی، اہلِ علم و تحقیق اور صاحبانِ فکر و نظر کے یہ دونوں طبقات اپنے اپنے شعبوں میں مہارت و حذاقت اور استقامت و استقلال و حق گوئی جیسی صفات سے متصف ہوں، مخلوقِ خدا کا درد ان کے لیے رحمت و رافت کا جذبہ، آزمائشوں میں آگے رہنے اور انعام و اکرام کی وصولی میں پیچھے رہنے کا حوصلہ، لطافتِ شعور، تو قد و ذکاء اور سب سے بڑھ کر اتقاء و بندگی کا جوہر بہ قدر مشترک موجود ہو۔ ابتداء سے اب تک تمام بلادِ اسلامیہ میں فقہ اسلامی کے باب میں جو کچھ ہو چکا ہے، وہ سب ان کے پیش نظر رہے، یہ دونوں طبقات ایک بار پھر ''شورائی طریقِ استنباط'' کی بنیاد ڈالتے جس کی ابتداء حضرتِ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمائی تھی، ان محققین علوم دینیہ و عصریہ کی رفاقت و باہمی مشاورت سے بحث و تمحیص کے بعد، نہایت مؤثر تعبیرات، عام فہم تحریرات اور جدید اصطلاحات کی صورت میں متفقہ مسائل کو قلم بند کرلیا جاتا۔ لیکن افسوس! حکومت اس طرف توجہ تو کیا کرتی، جوٹوٹا پھوٹا دین کا کام ہو رہا ہے، اس کو بھی جڑ بنیاد سے اکھاڑنے پر تلی ہے، مدارس عربیہ کا وجود اسے ایک آنکھ گوارا نہیں۔ حکومت نے اسلام، اسلامیات، اسلامی نظریات اور اسلامی ثقافت کے نام پر جتنے نام نہاد ادارے بنا رکھے ہیں ان کے سرکردہ حضرات میں سے ایک بھی، الا ماشاء اللہ، جدید دنیا کے مسائل کو درست اسلامی نقطۂ نظر سے تو کیا حل کرتا، بلکہ یہ متجددین الٹا امت میں فتنہ و فساد اور اسلامی اقدار و روایت کی بیخ کنی کا سبب اور ذریعہ بنے ہیں۔ بہ قول اشک رام پوری

وہ تو ہیں کھلے دشمن ان کا خیر سے کیا ذکر دوستی مگر حضرت آپ کی قیامت ہے

ان حالات میں ہم اربابِ مدارس کی خدمت میں درخواست گزار ہیں کہ آپ حضرات اس گئے گزرے دور میں اغیار کی مخالفتوں اور اپنوں کی سازشوں کے باوجود خدمتِ دین کا فریضہ حسبِ توفیق و استطاعت انجام دے رہے ہیں۔ اب یہ ذمہ داری بلکہ فریضہ خالصتاً آپ حضرات کے ذمہ آجاتا ہے، آپ لوگ اس کارہائے گراں مایہ کی انجام دہی سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، اور ایک بار پھر اس دکھوں کی ماری انسانیت کو سہارا دے سکتے ہیں، آپ دنیا کو ایک بار پھر یہ باور کرا سکتے ہیں کہ اس امت کی کشتی کو ہلاکت خیز طوفانوں، تیز و تند آندھیوں اور بھنور سے باصفا علماء ہی بچا سکتے ہیں اور جو کام اربابِ اقتدار لاکھوں روپے صرف کر کے بھی انجام نہ دے سکے وہ ان ''فقیرانِ خدامست'' نے باوجود ناداری و مفلسی کے کر دکھایا ہے۔ اور آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ:

خدا خود میر ساماں ہست اربابِ توکل را

اس نوع کے اجتہادات، اس کے طریقِ کار اور منہاج کے متعلق راقم کے پاس بہت سی تجاویز ہیں، لیکن وقت کی تنگی کے باعث قلم زد کرتا ہوں۔

[۷] اگر امت میں اپنی مذکورہ بالا قیود و شرائط کے ساتھ ''اجتہاد'' ضروری ہے، تو تقلید اس سے زیادہ۔ بلکہ بالاولیٰ ضروری ہے، قیامت کے دن کفار اسی بات پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ تو اپنی عقل سے سمجھا اور نہ ہی صاحبانِ عقل کی سنی، ہدایت کے قرآن میں دو ہی راستے بتلائے گئے ہیں، تحقیق یا تقلید:

لو کنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحاب السعیر [الملک:۱۰]

''کاش ہم سنتے یا عقل سے سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں سے نہ ہوتے''۔

بدوں تقلید، اجتہاد کا فلسفہ بلکہ اس کا حجتِ شرعیہ ہونا ہی لغو اور باطل ہو جائے گا کیونکہ قرآن کہتا ہے:

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون [النحل:۴۳/الانبیاء:۷] ''اہلِ علم سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے''۔

اور حدیث شریف میں آتا ہے: **انما الشفاء العی السوال** [مشکوٰۃ المصابیح: ج۱،۵۵] ''بے شک درماندہ کا علاج تو

پوچھ لینا ہی ہے''۔

سو جس طرح امت میں بہ وقتِ ضرورت مجتہدین کا وجود ضروری ہے اسی طرح بہ نصِ قرآن وحدیث غیر مجتہد کے لیے اہلِ علم سے سوال کر لینے ہی میں شفا وعافیت ہے، اگر تقلید ضروری نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک کے کیا معنی ہوں گے؟ **من افتیٰ بغیر علم کان اثمه علیٰ من افتاه** [مشکوٰۃ المصابیح، ج۱، ۲۷] ''جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دے گا اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا''۔

ظاہر ہے بلا معرفتِ دلیل، تقلیداً کسی کے فتویٰ پر عمل جائز ہوتا تو غلط فتویٰ دینے پر مفتی اور سائل دنوں کی گرفت ہونی چاہیے تھی، مفتی کی غلط فتویٰ دینے پر، اور سائل کی اس فتویٰ پر بلا تحقیق وبدوں معرفتِ دلیل عمل کرنے پر.....الغرض اجتہاد کے ساتھ تقلید کا تسلسل بھی از حد ضروری ہے، تفصیل اس موضوع پر اہلِ علم کی گراں قدر تالیفات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جب جب اس امت میں تقلید کی گرفت ڈھیلی پڑی ہے تب تب یہ امت نئے نئے فتنوں سے دوچار ہوئی ہے، مرزا غلام احمد قادیانی سے لے کر غلام احمد پرویز تک، سب ترکِ تقلید کے ''ثمرات'' ہیں اور اس کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔

[۸] ڈاکٹر اقبال مرحوم کے حوالہ سے، جو صاحبانِ فکر ونظر خامہ فرسائیوں میں مصروف ہیں، ان میں اکثر تحریریں، جذباتی، جارحانہ اور سطحی نوعیت کی ہیں، صرف ایک مضمون نہایت سنجیدہ ودیانت دارانہ، حقیقت افروز، علمی وفکری اور لائقِ مطالعہ ہے، جو محترم جناب احمد جاوید صاحب کے رشحاتِ قلم کا نمونہ ہے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ اس مضمون کی روشنی میں اپنے مؤقف پر نظرِ ثانی فرمائیں اور غلطی واضح ہو جانے پر قبول ورجوعِ حق سے دریغ نہ فرمائیں۔

[۹] ماہرینِ اقبالیات اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حضرتِ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''خطبات'' کی اشاعت کو ناپسند فرمایا تھا، اس سلسلہ میں امالی غلام محمدؒ پر ان حضرات کو بہت سے اعتراضات بھی ہیں، جو ممکن ہے درست بھی ہوں۔ لیکن جہاں تک خطبات کی اشاعت کو ناپسند کرنے کا سوال ہے تو میں کہتا ہوں کہ ''امالی'' کو تو رکھیے ایک طرف حضرتِ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جو ایک طرف ڈاکٹر اقبال کے مداح اور ان کی شاعری اور درست افکار وخیالات کے صرف موید ہی نہیں بلکہ عالمِ عربی میں اقبال کو مختلف پہلوؤں سے متعارف کروانے والے بھی ہیں۔ تو دوسری طرف حضرتِ علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کے براہ راست شاگرد اور ان کی شفقتوں اور عنایتوں اور فیوض وبرکات سے مستفید ہونے والوں میں سے بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کے مدراس کے خطبات جو انگریزی میں Reconstruction of Religions thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے اور ان کا اردو اور عربی میں ترجمہ بھی ہوا ہے، بہت سے ایسے خیالات وافکار ملتے ہیں جن کی تاویل توجیہہ اور اہلِ سنت کے اجماعی عقائد سے مطابقت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے یہی احساس، استاذِ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تھا، ان کی تمنا تھی یہ لیکچر شائع نہ ہوئے ہوتے تو اچھا تھا''۔ [نقوشِ اقبال، ص۴۰، حاشیہ]

مولانا سلیمان ندویؒ کی اپنی کسی تحریر کے سوا مذکورہ بیان سے زیادہ اور کوئی محکم ذریعہ نہیں ہے، جس سے مولانا سلیمان ندویؒ کی رائے کا علم ہو سکے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا تو اسے تسلیم کر لیا جائے یا مولانا علی میاں ندوی کی طرف کذب وخیانت کی نسبت کی جائے۔

[۱۱] آپ نے اسی شمارہ کے ص۲۸، پر ''تقویۃ الایمان'' اور ''سبقات'' کو حضرتِ سید احمد شہیدؒ کی طرف منسوب فرمایا ہے جب کہ یہ دونوں کتابیں حضرتِ شاہ اسماعیل صاحب شہیدؒ کی تصنیف کردہ ہیں، ریکارڈ درست فرمالیں۔

[۱۲] آپ نے اسی شمارہ کے صفحہ ۵ پر علامہ شبلی نعمانیؒ کے بارے میں جو قصہ چھیڑا ہے وہ نہایت دل آزار اور افسوس ناک ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ اپنے افکار وعقائد کی آزادی کے باوجود مسلمانوں میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤلف کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، اگر آپ کے بیان کردہ واقعات میں صداقت بھی ہو تو بھی اسے ان کے انتقال کے بانوے سال بعد اٹھانا ہرگز دانش مندی نہیں، جب کہ احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں آپ ''جدید صحافت کے نمائندے'' لگتے ہیں۔